© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

گزشتہ ترجمان القرآن میں ہم نے عربی مدارس کے نصاب پر بحث کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ فلسفہ، منطق اور علم الکلام کی جو کتب اس وقت ہمارے دینی مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں وہ اس قدر قدیم ہیں کہ رفتارِ زمانہ نے اُن کی افادیت کو بالکل ختم کر دیا ہے اس لیے ان کتابوں کی جگہ ان علوم وفنون کی جدید کتب کو داخلِ نصاب کرنا چاہیے۔ لیکن ان کتابوں کا من وعن داخل کرنا بھی خطرہ سے خالی نہیں۔ سب سے پہلے مغربی علوم وفنون کا سحر توڑنے کی ضرورت ہے۔ ان کا سحر توڑنے کے بعد جب انہیں نصاب میں شامل کیا جائیگا تو پھر انشاء اللہ ان کی افادیت بہت زیادہ ہو گی۔ ہمارے علماء ایک طرف تو جدید رجحانات سے واقف ہونگے اور دوسری طرف وہ ان کا ٹری دیدہ وری سے ابطال بھی کر سکیں گے۔ ہماری انہیں معروضات پر ہمارے ایک کرم فرما نے ہمیں ایک طویل مراسلہ بھیجا ہے، جس میں انہوں نے اسی حصّہ پر بحث کرتے ہوئے یہ دریافت فرمایا ہے کہ ہمارے نزدیک اس "سحرِ فرنگ" کو توڑنے کی صحیح تدبیر کیا ہے۔ یہ مسئلہ اگرچہ حسن تفصیل کا محتاج ہے یہ صفحات اُس کے متحمل نہیں لیکن اس موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم یہاں قدرے کھل کر بات کرتے ہیں۔

مغرب کا طلسم توڑنے کا ایک عام طریقہ جو ہمارے ہاں سر سیّد سے لیکر آج تک رائج رہا ہے وہ یہ ہے کہ مغربی افکار ونظریات کی مغربی مفکرین اور اہل علم کی آراء سے تردید کی جائے اور انہوں نے اسلامی معتقدات اور شعائر کے بارے جو تعریفی کلمات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہکے ہیں انہیں ہم زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی کوشش کریں۔ اس طریقہ کی افادیت سے مجھے انکار نہیں۔ اس سے بعض اوقات بڑے ہی مفید نتائج برآمد ہو جاتے ہیں لیکن اپنے تجربہ کی بنا پر بڑے وثوق سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک چلتا ہوا داؤں ہے جس کی کوئی مستقل اور پائیدار حیثیت نہیں ہوتی۔

جب ایک نوجوان کو کسی مغربی مصنف کا قول سنایا جاتا ہے۔ وہ وقتی طور پر تو اس سے بالضرور متاثر ہوتا ہے لیکن کچھ مدت کے بعد وہ یہ سوچنے لگتا ہے کہ اس قول کے مخالف بھی تو مغرب کے بہت سے اربابِ علم نے رائے دی ہے۔ پھر آخر اسی ایک قول پر کیوں اعتماد کر لیا جائے۔ اگر مغربی مفکرین کے دوسرے اقوال غلط ہیں تو یہ بھی غلط ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس کا اس طرزِ استدلال سے جلد ہی اعتماد اٹھ جاتا ہے اور پھر وہ اسی الجھنوں میں گرفتار ہو جاتا ہے جس سے وہ نکلنے کے لیے بیتاب ہوتا ہے۔

گزشتہ سولہ برس سے میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ہمارے وہ نوجوان جو ایف۔ اے تک اسلام کے پُرجوش مبلغ اور فدائی ہوتے ہیں، بی۔ اے اور ایم۔ اے میں پہنچتے ہی اُن کے ایمان میں اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے اور اُن کے اندر وہ جوش اور جاں نثاری نہیں رہتی جو ابتدائی جماعتوں میں نظر آتی ہے۔ اس تبدیلی میں بلاشبہ بہت سے دوسرے عوامل بھی شامل ہیں اور یہ صورتِ حال بھی سب کے معاملہ میں یکساں پیش نہیں آتی بلکہ بعض سعید روحیں جب ایک مرتبہ اسلام سے وابستہ ہو جاتی ہیں تو پھر اُسی کی ہو کر رہ جاتی ہیں لیکن میرا مشاہدہ یہی ہے کہ ہمارے طلبہ کی اکثریت اسی حادثہ کا شکار ہوتی ہے۔ اس افسوسناک تغیر کی منجملہ وجوہات میں ایک بڑی وجہ وہی ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے ہم جب تک ایک نوجوان کے افکار و نظریات کے لیے کوئی مثبت بنیاد فراہم نہیں کرتے اُس کا فکری جہاز ہمیشہ بے لنگر ہی رہے گا جسے باطل تصورات کی آندھیاں جس طرف چاہیں گی بہا کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے جائیں گی۔ مغربی افکار و نظریات کا سہارا تو محض سلبی سی چیز ہے، جس پر مستقل طور پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

استدلال کا یہ طریق اگر مفید ثابت ہو سکتا ہے تو اسی حد تک کہ اس کی مدد سے ہم مغربی افکار کے بارے میں اس باطل دعوے کی تردید کر سکتے ہیں کہ اہلِ مغرب کے معتقدات میں اساسی طور پر اتفاق و اتحاد ہے۔ مغرب اس بات کا دعویدار ہے کہ اُس کے نظریات تجربہ اور مشاہدہ کے آفریدہ ہونے کی وجہ سے حتمی اور قطعی ہیں اس لیے ان کے اندر کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ جس طرح سورج کے طلوع ہو جانے کے بعد کوئی دیدہ ور اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا بالکل اسی طرح تجربہ اور مشاہدہ کی اساس پر جن نظریات کی تشکیل ہوئی ہے اُن کے متعلق بھی دو آرا نہیں ہو سکتیں۔ مغربی مفکرین کے اقوال و نظریات کا اگر اختلافی پہلو نمایاں کیا جائے تو اس سے انشاءاللہ مفید نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ جن نظریات کو اہلِ مغرب ایمانیات کی حیثیت سے ہمارے نوجوانوں کے سامنے پیش کرتے ہیں ان کے اختلافات بیان کرنے سے ان کی یہ حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور نوخیز نسل پر یہ حقیقت آشکارا ہونے لگتی ہے کہ یہ محض ظن و تخمین کے ڈھکوسلے ہیں جن میں شک و شبہ کی پوری گنجائش موجود ہے اور جن کی صحت کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی۔ اس طرح ان کا طلسم کسی حد تک ٹوٹ سکتا ہے۔

سحرِ مغرب سے نوجوانوں کو بچانے کے لیے سارے سلبی طریقوں میں سے سب سے مؤثر طریقہ ہمارے نزدیک وہی ہے جس کی طرف شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ نے اپنی مشہور تصنیف "الفوز الکبیر" کے مقدمہ میں اشارہ فرمایا ہے۔ شاہ صاحب نے اگرچہ یہ ساری بحث یہود، نصاریٰ، مشرکین اور منافقین کو سامنے رکھ کر کی ہے۔ لیکن اُن کے ارشادات سے آج بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پوری طرح استفادہ کیا جا سکتا ہے اور عہد حاضر کے مادہ پرستوں کے اثرات زائل ہو سکتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں شاہ صاحب کے مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ علم اخلاق جو اسلام ہمیں سکھاتا ہے اس کی تعلیم دو طریق سے دینی چاہیے۔ سب سے پہلے ایجابی طور پر لوگوں کو شریعت کے اوامر و نواہی سے روشناس کرایا جاتے۔ دوسرے سلبی طور پر اُن اخلاقِ حمیدہ کے تارکین کی زندگی میں جو معائب پیدا ہوتے ہیں اُن کی تفصیل بیان کی جاتے۔ شاہ صاحب علیہ الرحمہ کے بتاتے ہوتے اس دوسرے طریقے کو اگر پوری ذہانت سے آزمایا جائے تو لوگوں کے دلوں سے مغرب کی برتری بالکل ختم ہو سکتی ہے۔ ہم اپنی نوخیز نسل کو یہ بتانے کی کوشش کریں کہ جن افکار و نظریات پر تم مٹے جا رہے ہو اُن کو جب دنیا میں بالفعل نافذ کیا گیا تو کون سے خطرناک نتائج برآمد ہوتے۔ کسی نظریہ کی محض ظاہری آب و تاب دیکھ کر اُس سے مرعوب ہو جانا کوئی صحیح چیز نہیں بلکہ اُس کی صحت کا اصل معیار وہ سوسائٹی ہے جس کی وہ نظریہ تشکیل کرتا ہے۔ کسی نظریہ کی صحت کو پرکھنے کا یہ فلسفہ عملیت (PRAGMATISM) نوجوانوں کے لیے بڑا مفید ثابت ہوتا ہے۔

اسلام کو دنیا میں مقبول بنانے کے لیے جتنی تدابیر کی جائیں اُن میں نتیجہ کے اعتبار سے سب سے زیادہ خطرناک تدبیر یہ ہے کہ اسلام کو کھینچ تان کر مغربی افکار و نظریات کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے یا اس میں سے وہ چیزیں نکالی جائیں جو فی الواقع اس میں موجود نہیں یا اس کے اندر اُن کاموں کا جواز ڈھونڈا جائے جنہیں یہ دنیا سے مٹانے کے لیے آیا تھا۔ دین کے معاملے میں جن لوگوں نے بھی یہ روش اختیار کی ہے اُن کی نیتیں خواہ کتنی ہی اچھی اور آرزوئیں خواہ کتنی ہی مقدس ہوں لیکن یہ دین کے لیے سم قاتل ثابت ہوتی ہیں۔ اس سے سحر ٹوٹتا نہیں بلکہ اس کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہو جاتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کا سب سے پہلا اثر انسان کے ذہن پر یہ مرتب ہوتا ہے کہ وہ معیارِ حق اُسی نظامِ حیات کو سمجھتا ہے جس کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لیے دین کے اندر قطع و برید کی جا رہی ہے۔ یہ چیز فطرت کے عین مطابق ہے۔ جب آپ ایک نظامِ حیات کے اندر محض اس لیے تبدیلیاں شروع کر دیں کہ وہ ایک غالب نظام کے موافق اور مطابق بن جائے تو انسان کے دل میں بالکل قدرتی طور پر اُسی نظام کی برتری کا نقش ثبت ہوتا ہے جس کے مطابق دوسرے نظام کو ڈھالا جا رہا ہے۔ وہ بلاشبہ اپنے نظام سے چمٹے رہنے کے لیے اپنے دل کو یہ تسلی ضرور دے سکے گا کہ میرا نظام بھی اسی طرح کا ہے لیکن اُس کے دل میں حقیقی عظمت اُسی آئیڈیل نظام کی ہوگی جس پر وہ اپنے دین کو پرکھ رہا ہے۔

گذشتہ دو سو برس میں مسلمانوں نے اس قسم کی جتنی کوششیں کی ہیں اُن سے دین کو فائدہ حاصل ہونے کی بجائے سخت نقصان پہنچا ہے۔ سر سیّد مرحوم اور اس کے ساتھیوں کے اس معذرت خواہانہ طرزِ عمل نے مغربی افکار و نظریات کو دین کے اندر داخل ہونے کے مواقع فراہم کیے، اور لوگوں کے دلوں میں بالکل غیر محسوس طور پر مغرب کی برتری کا احساس پیدا ہوتا گیا۔ آپ اس گروہ سے تعلق رکھنے والے کسی شخص کی اچھی سے اچھی کتاب کا مطالعہ کریں اور پھر دیکھیں کہ کیا اُسے پڑھنے کے بعد مغرب کا طلسم ٹوٹتا ہے اور دل میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کو ہی دنیا میں ایک طاقتور قوت بننا چاہیے۔ میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے آج تک اس قسم کے جتنے حضرات سے ملنے کا موقع ملا ہے اُن کے ذہنی تاثرات کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں: "مغرب نے بڑی ترقی کی ہے اور یہ سب اسلامی تعلیمات کا اثر ہے۔ مگر افسوس کہ "ملّا" نے ان رازوں کو ہم سے چھپا کر رکھا۔ اب ہمیں مغرب سے یہ نظریات لے لینے چاہئیں۔ دراصل مغربی نظام اسلام کا ہی ایک ترقی یافتہ ایڈیشن ہے"۔ اس ذہنی ساخت کے ساتھ آپ خود ہی غور کریں کہ انسان کے دل میں اس دینِ حق کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تمام ادیان پر غالب کرنے کا داعیہ کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اس رعایت کا طالب ہوتا ہے کہ اُسے اس دین کے نام لیوا کی حیثیت سے زندہ رہنے دیا جاتے اور وہ بھی اس وجہ سے نہیں کہ اس میں کوئی ذاتی کشش ہے بلکہ محض اس بنا پر کہ اس دین میں اور مغرب میں کوئی جوہری اختلاف نہیں اس لیے اس کا ترک کرنا جذبات کے نقطۂ نگاہ سے تکلیف دہ ثابت ہوگا۔

دین سے یہ جذباتی لگاؤ بھی صرف ایک دو نسلوں تک محدود ہوتا ہے اور اُن کے چلے جانے کے بعد جب کچھ زیادہ روشن خیال لوگ معاشرے میں پیدا ہوتے ہیں تو یہ معمولی سا تعلق بھی باقی نہیں رہتا اور نوجوان بڑی بیباکی کے ساتھ دین کا قلادہ اپنی گردنوں سے اتار پھینکتے ہیں۔ وہ برملا کہتے ہیں کہ معیارِ حق جب مغرب ہے تو پھر اسلام کو درمیان میں لانے کی کیا ضرورت ہے۔ کون اسلامی تعلیمات کی ان درمیانی الجھنوں سے گزرتا ہوا منزلِ مقصود تک پہنچے۔ یہ سب بیکار کی زنجیریں ہیں جن سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنا ہی معاشرے کے لیے مفید ہے۔ آج کا نوجوان اسلام سے جس طرح بدظن ہو رہا ہے اُس میں کافی دخل ہماری اس غیر دانشمندانہ روش کا بھی ہے جسے ہم چند سال پیشتر اسلام کے لیے سراپا خیر سمجھتے تھے۔

یہ معاملہ صرف اسلام تک ہی محدود نہیں، تاریخ کے اوراق اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ مذہب کی ساری وہ تعبیریں جو مادی ماحول سے متاثر ہو کر کی گئیں، انہوں نے وقتی طور پر تو مذہب کو کچھ سہارا دیا مگر جلد ہی اس کی تباہی و بربادی کا سبب بھی بنیں۔ اہل رومانے عیسائیت کو قبول کیا کہ جب اسے اپنے مادہ پرستانہ افکار سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی تو اس سے بت پرستی، شاہ پرستی اور طبقاتی تقسیم نے جنم لیا اور عیسائیت نے ایک ایسی صورت اختیار کر لی جو مذہب سے زیادہ الحاد سے ملتی جلتی تھی۔ جس میں تعلق باللہ برائے نام رہ گیا اور مذہبی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لوگ انہی گندگیوں سے ملوّث ہوئے جن سے دنیا پرست آلودہ تھے۔

مارٹن لوتھر اور اُس کے رفقائے کار کی کوششیں اس ضمن میں بڑی عبرتناک ہیں۔ عوام مارٹن لوتھر کو بے شک عیسائیت کا ہیرو کہتے رہیں لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ اس شخص نے عیسائیت کو بالکل برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ سب اسی مادہ پرستانہ طرزِ فکر کا کرشمہ ہے کہ آج کا عیسائی سوائے سیاسی مفادات کے حصول کے مذہب سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ وہ اپنی زندگی کے ہر معاملے میں اپنے آپ کو بالکل آزاد سمجھتا ہے اور مذہب کی کسی پابندی کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا بلکہ ایسی کسی پابندی پر غور کرنے کو بھی انسانیت کی توہین خیال کرتا ہے۔ لوتھر کے غلط طرزِ استدلال نے مسیحی دنیا کی وحدت کو پارہ پارہ کیا اور عیسائیوں کے دل و دماغ میں اس باطل تصوّر کی آبیاری کی کہ وہ مذہب کو اپنی قومیت کی بنیاد بنانے کی بجائے وطن کو اس کی اساس بنائیں۔ اس تبدیلی سے انسان اور انسان کے درمیان سارے مقدس اور لطیف رشتے ٹوٹ گئے اور انسان محض مادی فوائد ولذائذ کے حصول کے لیے ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہو گیا۔

پھر اسی کے نظریات وافکار نے انسان کو اپنے سفلی جذبات کی پرستش کی ترغیب دی اور اسے محض ایک حیوانِ ناطق بنا کر رکھ دیا۔ زندگی کی ساری اعلیٰ اور ارفع اقدار جو درحقیقت انسانیت کا جوہر ہیں وہ سب آہستہ آہستہ مفقود ہو گئیں۔ آپ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پرستاروں اور ان کے انکار کرنے والوں کی زندگیوں کا جائزہ لیں تو آپ ان کے درمیان کسی قسم کا کوئی فرق محسوس نہیں کر سکتے۔ سوائے نام کے اب ان کے مابین اور کوئی وجہ امتیاز باقی نہیں رہی۔ اگر مسیحیت کے اندر یہ تحریف نہ ہوتی تو جو لوگ فی الواقع عیسائی رہنا چاہتے تھے وہ اتنے بے راہ رو نہ ہوتے جتنے کہ یہ لوگ آج ہیں۔ عیسائیت کے اندر اس کے کرم فرماؤں نے ساری وہ چیزیں شامل کر دی ہیں جو مادہ پرستی میں ہو سکتی ہیں اس لیے یہ لوگ عیسائی ہونے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے باوجود ہر کام کو بڑی آزادی سے کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں بھی بدقسمتی سے اسی قسم کی کوششیں ایک لگے بندھے منصوبے اور پلان کے تحت جاری ہیں اور غلط فہمی سے اس "اعتزال" کو خدمتِ دین سمجھ لیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس روش کے بُرے انجام سے بچائے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمان اگر ایک مرتبہ اس راہ پر چل پڑے تو پھر وہ الحاد اور کفر کی دستبرد سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ مسلمانوں کو مغربی نظامِ حیات کا مقلد بنانے کے لیے دین کے اندر جس قسم کی تبدیلیاں پیدا کی جارہی ہیں وہ اگر خدانخواستہ کامیاب ہوگئیں تو پھر دین کی پوری عمارت ہی منہدم ہوجائے گی۔

اِس طرزِ فکر سے انسانی ذہن پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں ہم یہاں اُس کی دو مثالیں پیش کرتے ہیں:

روس کے بڑھتے ہوئے اقتدار نے قوموں کے اندر اپنے ذرائع و وسائل کو حکومت کی تحویل میں دینے کا ایک عام رجحان پیدا کر دیا ہے۔ اب ایک صاحب اٹھتے ہیں اور کہتے ہیں، کیونکہ زمین ساری اللہ کی ہے اور زمین سے علمِ معیشت میں مراد قدرت کے وہ عطیات ہیں جن سے انسان رزق کا سامان حاصل کرتا ہے اس لیے شخصی ملکیت کا نظریہ بنیادی طور پر غلط ہے اور قرآن ہم پر یہ فرض عائد کرتا ہے کہ ہم سارے وسائلِ رزق کو حکومت کے حوالے کر دیں اور حکومت ہمیں جتنا نپا تُلا چارہ دیتی رہے اُسی پر گزر اوقات کریں۔

اس نظریہ میں چونکہ اس وقت کشش کے بہت سے پہلو موجود ہیں، ایک تو اس بنا پر کہ یہ دنیا کے بڑھتے ہوئے اقتدار کا نظریہ ہے، اور دوسرے سرمایہ داری کے مظالم سے ستائی ہوئی مخلوق کچھ تبدیلی چاہتی ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ چند نیم خواندہ نوجوان خود اس کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ اور مفکرِ قرآن کی اس "نکتہ وری" پر دل ڈھول کر داد دیں۔ پھر یہ معلوم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہونے پر کہ اُن کے دلپسند افکار کی قرآن مجید بھی تائید کرتا ہے، اُن کے اندر کلام پاک سے ایک وقتی سا تعلق بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ ذہن میں رہے کہ اُن کی دلچسپی کا اصل مرکز کتاب الٰہی نہیں بلکہ قومی ملکیت کا وہ فلسفہ ہے جسے وہ قرآن میں محفوظ پاتے ہیں۔

انسانی فکر کوئی غیر متحرک چیز نہیں کہ وہ اسی مقام پر آکر رک جائے۔ وہ جب آگے بڑھتی ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے قومی ملکیت کے بارے میں جو یہ طرزِ عمل اختیار کیا ہے وہ باقاعدہ ایک مادہ پرستانہ فلسفے کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ وہ اس فلسفے کی پوری تاریخ پر نگاہ ڈالتا ہے اور دیکھتا ہے کہ یہ تبدیلی فرد اور جماعت کے باہمی تعلق کے تغیر سے وابستہ ہے انسان نے جب بھاپ سے کام لینا شروع کیا تو پیداوار وسیع پیمانے پر ہونے لگی۔ جو لوگ گھروں میں اپنے ہاتھ سے کام کرتے تھے وہ کارخانوں میں آکر بے بس غلام بن گئے۔ انسانوں کے اس ریوڑ کے مقابلے میں سرمایہ اور مشین کی اہمیت بڑھنے لگی۔ بالآخر انسان نے یہ طے کیا کہ ان دو چیزوں کی ہر قیمت پر حفاظت اور پاسبانی کی جانی چاہیے اور فرد کو جتنا بے بس اور کمزور کیا جائے گا اتنا ہی وہ اس فرض کو بخوبی سرانجام دے سکے گا۔ اس لیے فرد کے مقابلہ میں اجتماعیت کو پورے اختیار سونپ دیئے گئے اور اس اجتماعیت کا دائرہ پھیلتے پھیلتے ساری ریاست پر محیط ہو گیا۔ فکر و نظر کی اس تبدیلی کا محرک چونکہ ذرائع پیداوار کے تغیرات ہیں اس لیے اس فلسفہ کے حامیوں نے تاریخ کے متعلق بھی یہ قطعی فیصلہ کر دیا کہ انسانیت آج تک جتنے انقلابات سے گزری ہے وہ سب ذرائع پیداوار کی تبدیلیوں کا مظہر ہیں اور انسانیت نے قانون و اخلاق، تمدّن و سیاست، مذہب اور اخلاق کے جو مختلف پیکر تیار کیے ہیں وہ سب ذرائع پیداوار کے سانچوں میں ڈھلے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ جب ایک نوجوان کی نگاہ میں نیشنلائزیشن کے عملی پہلو بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سامنے آئیں گے کہ اس سے ایک ایسا نظام معرضِ وجود میں آتا ہے جو سیاسی اعتبار سے ایک انتہائی ظالمانہ ڈکٹیٹر شپ کو جنم دیتا ہے۔ جسے کامیابی سے چلانے کے لیے ذرائع پیداوار کی منصوبہ بندی کے علاوہ جذبات و احساسات کی بھی منصوبہ بندی کرنی پڑتی ہے، جس میں فرد کے روحانی ارتقاء کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہوتی، کیونکہ جب تک ایک شخص کو آزادی کے ساتھ اپنا لقمۂ رزق کمانے کا موقع بہم نہیں پہنچتا اس کا ذہن آزادی سے سوچ بھی نہیں سکتا۔ تو ان سب حقائق کے سامنے آجانے کے بعد وہ اُن کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کرے گا۔ اس کا اثر لازمی طور پر یہ ہوگا کہ وہ نہ صرف اس نظام سے بغاوت پر آمادہ ہوگا بلکہ اُس قرآن پر سے بھی اُس کا اعتماد جاتا رہے گا جو ایسی غلط باتوں کی تعلیم دیتا ہے۔

یہ تو معاملے کا صرف ایک پہلو ہے۔ ایک انسان جب اجتماعیت پرستی کے اس فلسفہ کا دوسرے زاویۂ نگاہ سے مطالعہ کرتا ہے تو صورتِ حال اس سے بھی بدتر پاتا ہے۔ وہ غور و فکر کے بعد خود بخود اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اگر فرد کا مصرف صرف اسی قدر ہے کہ اسے اجتماعیت کی خواہشات پر بھینٹ چڑھا دیا جائے اور اس کی اپنی الگ کوئی حیثیت نہیں تو پھر اسے خالقِ کائنات کی بجائے اپنی قوم کے سامنے سجدہ ریز ہونا چاہیے۔ اس نظریہ کو اپنانے کے بعد وہ اپنی قوم کو اپنا معبود بنانے پر مجبور ہوتا ہے۔ جرمنی میں ہٹلر، روس میں سٹالن اور جاپان میں شنتنا کے اندر الوہیت کی جو شان پیدا کی گئی ہے وہ اسی طرزِ فکر کا مظہر ہے۔ اس کے نتیجے میں کسی قوم کے افراد یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اُن کی زندگی کا منتہائے مقصود اُن کی روحانی اور اخلاقی ترقی نہیں بلکہ قوم کی اجتماعی فلاح ہے اور فلاح سے بھی اُن کی مراد صرف مادی خوشحالی ہوتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ نقطۂ نظر ایک ذہین انسان کے لیے زیادہ دیر تک قابلِ کشش نہیں رہ سکتا۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ اگر فرد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معاشرے کے ہاتھ میں اتنا ہی بے بس ہے اور اس کی حیثیت ایک بے حس مشین میں پرزے سے زیادہ کچھ بھی نہیں تو پھر انسان اور حیوان میں کیا فرق ہے۔

اس کے بعد وہ ذہین نوجوان تاریخ کے اوراق الٹتا ہے اور دیکھتا ہے کہ قوت کا یہ مجنونانہ ارتکاز خود اتنا ظالمانہ عمل ہے کہ انسانیت اسے عرصہ دراز تک برداشت نہیں کر سکتی اس کے خلاف چند ہی سالوں کے بعد ایک شدید ردعمل شروع ہوتا ہے اور پھر لوگ انفرادیت کی طرف جھک جاتے ہیں۔ رومیوں کے دورِ عروج میں قوت و طاقت جس غلط طریق سے سمٹ کر حکومت کے قبضے میں چلی گئی تھی اسی نے اُن کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا اور اُن کے زوال کے بعد نہ صرف عظیم الشان سلطنت چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ گئی بلکہ لوگوں پر رہبانیت کا بھی ایسا جنون سوار ہوا کہ اس کی یاد سے آج بھی روح کانپ اٹھتی ہے۔ ایک انسان جب مسلسل مطالعہ اور غور و فکر کے بعد زمان و مکان کی تنگ دامانیوں سے نکل کر انسانیت کی پوری تاریخ پر نگاہ ڈالتا ہے تو اسے فوراً یہ احساس ہوتا ہے کہ اجتماعیت پرستی کا یہ مسلک زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسے اگرچہ آجکل مادہ پرستی نے بام بلند پر پہنچا دیا ہے لیکن یہ عروج ہی اس کے فنا کا پیش خیمہ بھی ہے۔ اسے بہرحال دنیا سے ٹلنا اور فنا ہونا ہے۔ آپ خود ہی غور کریں کہ جب قرآن مجید سے اس غلط قسم کی اجتماعیت پرستی کو برحق ثابت کیا جائے گا تو ایک صاحبِ عقل خود قرآن پاک کے متعلق کیا رائے رکھیگا۔ کیا ان حقائق کو جانتے ہوئے بھی وہ قرآن پاک پر ایمان لا سکتا ہے! اجتماعیت پرستی کے اس نظریہ کے مقاصد کو جاننے کے بعد وہ ان ساری چیزوں سے انکار کر دیگا جو اس کی تائید کرتی ہیں اور جتنی کوئی چیز زیادہ مقدس ہو گی اتنا ہی وہ اس سے زیادہ بدظن ہو گا

اسلام کی ازلی اور ابدی اقدار کو وقتی تحریکات سے متاثر ہو کر زمان و مکان کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حدود میں مقید کر دینا اسلام کے ساتھ سب سے بڑی دشمنی ہے۔ اسلام ایک میزان عدل ہے جس کی مدد سے افکار و اعمال کی قدر و قیمت کا صحیح صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن اگر کوئی اسلام کا نادان دوست ان باطل تصورات کو معیارِ حق سمجھ کر دین کی میزانِ عدل میں اس طرح کی تبدیلیاں کرتا ہے کہ جن سے یہ غلط معتقدات تول میں پورے اتر سکیں تو یہ اس "میزانِ عدل" کے ساتھ صریح ظلم اور زیادتی ہے اور کسی فرد یا گروہ کا یہ فعل خواہ کتنا ہی نیک نیتی پر مبنی ہو۔ اس میزان سے لوگوں کو یقینی طور پر برگشتہ کر دیگا۔ جب لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ اس میزان کے پلڑوں کو ذاتی خواہشات اور وقتی تقاضے جس طرف چاہیں جھکا سکتے ہیں تو پھر وہ اسے خدائی میزان ماننے پر کیونکر تیار ہو گا، بلکہ لوگ اسے بھی ایک سیاسی اور معاشی فریب کاری سمجھیں گے جسے بڑی ہوشیاری کے ساتھ میزانِ الٰہی کا نام دے دیا گیا ہے

اسلام کے اندر ریوں تو ہر قسم کی تبدیلی سخت خطرناک ہے لیکن اس تبدیلی کے محرکات جب مادی ہوں تو پھر یہ تغیرات اس دین کی بربادی کا پیغام ہیں۔ اسلام نے بلا شبہ حیاتِ انسانی کے مادی تقاضوں سے صرفِ نظر نہیں کیا لیکن یہ تقاضے اس کی اساس اور بنیاد نہیں۔ اس دین کی بنیاد تعلق باللہ اور خوفِ آخرت پر رکھی گئی ہے۔ یہاں رضائے الٰہی ہی ایک انسان کا مقصود و مطلوب ہے۔ اب اگر کوئی شخص اسلام کے اندر اس طرح کی تبدیلیاں کرتا ہے کہ رضائے الٰہی کی جگہ طلبِ دنیا اس کا نصب العین قرار پائے تو اس کے بعد وہ شخص جلد ہی الحاد کی آغوش میں چلا جائے گا۔ آج تک دنیا میں جب کبھی لوگ اس عزم کے ساتھ اُٹھے کہ مذہب کو وقت کی مادی تحریکات کے تابع کر دیا جائے تو ان کے چلے جانے کے بعد لوگوں کے اندر بڑی بے دینی پھیلی۔ مارٹن لوتھر کے انتقال کے کچھ مدت بعد یورپ میں جس سرعت کے ساتھ الحاد اور زندقے کو فروغ حاصل ہوا وہ ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آج اگر عیسائیت کا یورپ میں کچھ غلغلہ ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہاں کے عوام کو عیسائیت سے محبت ہے یا وہ اس کی پابندیاں برداشت کرنے میں گوناگوں راحت محسوس کرتے ہیں۔ وہ اگر عیسائیت کے نام لیوا ہیں تو صرف اس لیے کہ اُن کا مذہب اب اتنا تغیر پذیر ہے کہ ہر سانچے میں ڈھل سکتا ہے اور اُس کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ اس میں کفر اور الحاد تک بھی بڑی آسانی کے ساتھ سما سکتے ہیں۔ اس لیے اہلِ مغرب اب لا مذہب ہونے کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ عیسائیت اگر اُن کی خواہشات کی راہ میں کسی طرح بھی مزاحم ہوتی تو وہ اسے مدت سے خیرباد کہہ چکے ہوتے۔

خود ہمارے ہاں گزشتہ صدی میں سرسید مرحوم کی ذراسی لغزش نے ہمارے لیے ایسے پیچیدہ مسائل پیدا کر دیے ہیں کہ ہم ان کو آج تک سلجھا نہیں سکے۔ اُس بیچارے نے تو خیر اسلام اور سائنس کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے بعد نیچریت نے اپنی راہ ہموار کرنی شروع کی اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا تو ذکر ہی کیا، بڑے بڑے علما تک اس سے متاثر ہوئے۔ پھر یہاں فتنۂ انکارِ حدیث پھیلا۔ اور سائنس تو ایک طرف رہی، مسلمانوں کے تجدد پسند طبقے نے اسلام کے دروازے اُن ساری گمراہیوں کے لیے کھول دیئے جنھیں اللہ تعالیٰ کا یہ آخری دین دنیا سے مٹانے کے لیے آیا تھا۔ آج اسلام کے نام پر اس ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب کچھ یورپ کی مادی تحریک سے ذہنی مرعوبیت کا نتیجہ ہے۔ یہ تو خدا کا خاص فضل ہوا کہ علمائے حق نے اس خطرے کو بروقت بھانپ لیا اور اس کے اثرات کو مٹانے کی کوشش کی۔ لیکن اگر یہ طرزِ فکر کامیاب ہو جاتا تو آج اسلام بھی اُسی پست مقام پہ ہوتا جس پر آج کل عیسائیت ہے۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم، ہمیں دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ سے مؤدبانہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گزارش یہ کرنا ہے کہ وہ خدارا اس فریب میں نہ آئیں کہ اسلام کے اندر مغربی افکار و نظریات داخل کرنے سے، یا اس دینِ حق کو مغربی تہذیب و تمدن کے ساتھ ہم آہنگ کرنے سے اس دین کو قوت و طاقت فراہم ہوگی اور وہ مغرب کے بڑھتے ہوئے الحاد اور مادہ پرستی کا کامیابی سے مقابلہ کر سکے گا۔ ممکن ہے آپ ایک نیم خواندہ نوجوان کو کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ کی آیت سنا کر وقتی طور پر یہ باور کرا سکیں کہ قرآن بھی نظریۂ ارتقاء کی تائید کرتا ہے۔ اور یہ صرف ڈارون اور ہیگل کے ذہن کی کرشمہ سازی نہیں، سود کو پیداواری اور غیر پیداواری کاموں میں تقسیم کر کے لوگوں کی کاروباری ضروریات کے پیشِ نظر اس کے جواز کا فتویٰ دیکر خراجِ تحسین بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح تحدیدِ نسل کو بھی امت کے اجتماعی مفاد کے نام پر جائز ٹھہرایا جا سکتا ہے لیکن یہ محض فریبِ نظر ہے جس سے کچھ مدت تک تو لوگوں کو دھوکہ دینا ممکن ہے۔ لیکن حقیقت جلد ہی بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ اور لوگوں پر جب ایک مرتبہ یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے تو پھر وہ ان نظریات سے اور ان کی تائید کرنے والے افکار سے اس حد تک متنفر ہو جاتے ہیں کہ الحاد سے کم کسی مسلک کو قبول نہیں کرتے۔

مغرب کے یہ سارے نظریات اپنی پشت پر مادہ پرستانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ ڈارون اور ہیگل کے افکار کو لوگ اس بنا پر نہیں مانتے کہ وہ کوئی ایسی بڑی صداقتیں ہیں جنہیں جھٹلانا ناممکن ہے۔ اہلِ مغرب ان پر اس لیے ایمان رکھتے ہیں کہ ان کی مدد سے وہ معاشی کشمکش کے لیے وجہِ جواز فراہم کر سکتے ہیں، ہیگل مادہ پرستی کے تاریک مستقبل کو روشن بناتا ہے، سود اجتماعیت کو طاقتور بنانے کا مؤثر ذریعہ ہے، تحدیدِ نسل کو مالتھس کے نظریۂ آبادی نے جنم دیا ہے اور یہ نظریہ خالقِ کائنات کے متعلق نہایت گمراہ کن تصورات پیدا کرتا ہے۔ اس کے پس پردہ جو ذہنیت کام کرتی ہے وہ یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ معاذاللہ بڑا بخیل اور بے رحم ہے اور اس نے انسانوں کے ساتھ بڑا شرمناک سلوک روا رکھا ہے۔ اس نے انسانوں کے اندر جس سرعت کے ساتھ بڑھنے کی صلاحیت رکھی ہے خوراک کو اس تناسب سے بڑھانے کا انتظار نہیں کیا۔ اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وجہ سے یہ روش بنیادی طور پر غلط ہے کہ مغربی تہذیب کے ان باطل تصورات کی تائید میں قرآن مجید کو محض اس لیے کھڑا کیا جاتا ہے کہ ان افکار کو آج کل قبولِ عام حاصل ہے اور ایسا کرنے سے ہم نوجوان نسل کو کفر و الحاد سے بچا سکیں گے۔ مغربی طلسم کو توڑنے کا صحیح طریقہ وہی ہے جو ہمارے بزرگوں نے اپنے عہد کے طلسمات کو توڑنے کے لیے اختیار کیا تھا۔ انہوں نے اسلامی تعلیمات کو وقتی تقاضوں سے متاثر ہوئے بغیر جوں کا توں پیش کیا۔ ان میں نہ تو اپنی طرف سے کوئی کمی کی اور نہ بیشی اور اس طرح اسلامی اقدارِ حیات کی مستقل اور پائیدار حیثیت کو پوری طرح برقرار رکھا لیکن دین کی حفاظت اور پاسبانی کے ساتھ ساتھ ہر فتنے کو مٹانے کی بھی پوری پوری کوشش کی۔ انہوں نے دینی حصار میں قطعاً کوئی شگاف نہ پیدا کیا بلکہ اگر کوئی پیدا بھی ہو چکا تھا تو اسے بڑی مضبوطی کے ساتھ بند کیا اور آگے بڑھ کر باطل افکار و نظریات پر بالکل جدید اسلحہ سے مسلح ہو کر اس قوت کے ساتھ حملہ کیا کہ باطل کو کہیں سر چھپانے کی جگہ نہ ملی اور وہ حرفِ غلط کی طرح دنیا سے مٹا دیا گیا۔

دور نہ جائیے، اپنے اس ملک کے نامور مفکر حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ کے کارناموں پر ایک نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ باطل کا کونسا پہلو ہے جس پر انہوں نے بھرپور تنقید نہیں کی۔ افکار و نظریات کے بنیادی مسائل سے لیکر اعمال کی معمولی سے معمولی جزئیات تک ان کی گرفت میں آگئیں۔ انہوں نے ایک تجربہ کار طبیب کی طرح فساد کے ایک ایک مرکز کو تلاش کیا اور بڑے حکیمانہ طریق سے اس پر نشتر لگا کر امتِ مسلمہ کے جسم سے فاسد مادہ کو خارج کرنے کی کوشش کی لیکن ان کی ساری کتب کا مطالعہ کر جائیے آپ کو کہیں اس امر کا نشان نہیں ملیگا کہ وہ وقت کے فلسفوں سے مرعوب ہو کر دین میں تبدیلی کر رہے ہیں۔ انکی تصانیف زمان و مکان کے خوفناک کی گندگی سے یکسر پاک و صاف ہیں۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ کتابیں اس زمانہ میں لکھی گئی ہیں جب امن و امان اس ملک سے رخصت ہو رہا تھا اور مغربی تہذیب سرعت کے ساتھ ہندوستان کی طرف قدم بڑھا رہی تھی۔ ایسے پر آشوب حالات میں اپنے دین پر اتنا غیر متزلزل ایمان ہی شاہ صاحب کی عظمت کی سب سے بڑی شہادت ہے اور اسی میں ان کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔

© rasailojaraid.com